رہائشی تعمیرات کی شرعی حیثیت

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

از
فقیہ العصر حضرت مولانا
مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی
نور اللہ مرقدہ

www.alhaqqania.org

فقیہ العصر مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ

''رہائشی تعمیرات کی شرعی حیثیت''

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

جنگ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں عنوان بالا کے تحت (رفیع اللہ شہاب کے مضمون میں) بعض آیات واحادیث کی غلط تشریح کرتے ہوئے اس اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ کے لفظ ''عفو'' کا ترجمہ ضروریات سے زائد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ تم دوسرے بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کردو''۔

آیت قرآنی کا صحیح مفہوم

حالانکہ پوری آیت کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کرنے پر کہ کیا خرچ کریں؟ ان کو بتلایا گیا کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

اور سوال کرنے پر جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کو بتلایا گیا وہ حکم لازمی نہیں ہوسکتا کیونکہ لازمی اور ضروری حکم تو بغیر پوچھے ہی

بتلایا جاتا ہے اس لیے اس سوال کے جواب میں جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرنا ضروری قرار نہیں دیا جا سکتا اختیاری ہی ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اس لفظ کے ترجمہ میں بڑی وسعت ہے مفسرین نے اس کا ترجمہ دوسری طرح بھی کیا ہے اور اس سے وہ مال مراد لیا ہے جس کا خرچ کرنا بار خاطر نہ ہو، اس معنی کے پیش نظر پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہو گا کہ ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرما دیجئے کہ جتنا آسان ہو''۔

نیز تفسیر ابن کثیر میں ''عفو'' کا معنی ستھرا، پاکیزہ اور عمدہ مال بھی کیا گیا ہے، اور یہ معنی امام ربیع سے منقول ہیں، اس کے لحاظ سے آیت بالا کا مفہوم یہ ہو گا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کیا جائے وہ عمدہ مال ہو گھٹیا نہ ہو۔

شرعی احکام کا ساقط قرار پانا

اگر زیر نظر مضمون میں ذکر کردہ یہ معنی درست تسلیم کر لیے جائیں کہ جو کچھ ضروریات سے زائد ہو وہ دوسروں کو دے دیا کرو اور اس حکم کو اختیاری تعلیم کی بجائے لازمی مان لیا جائے تو اس معنی کی رو سے دوسری آیات و احادیث سے ثابت شدہ بہت سے احکام مثل زکوۃ وغیرہ کے ساقط ہو جائیں گے اور دوسری آیت کے بھی یہ معنی خلاف

ہو جائیں گے، چنانچہ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۳ میں ہے: ''جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

اور آیت ۲۶۷ میں ہے: ''اے ایمان والو خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے''۔

اس طرح کی اور دوسری آیات میں بھی یہی مضمون ہے کہ اللہ نے جو مال عطا فرمایا ہے اور زمین میں سے جو کچھ پیدا کیا ہے اس مال اور پیداوار میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تشریح حدیثوں میں کر دی گئی ہے کہ وہ کتنا حصہ ہے جس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا لازمی ہے۔

اگر ضروریات سے زائد کل مال دوسروں کو دے دینا ضروری ہو تو حدیثوں میں اس حصہ کو معین کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی اور ایسی سب حدیثیں جن میں مال کے حصہ معینہ کے خرچ کرنے کا حکم بطور فرض کے دیا گیا ہے بے ضرورت اور ناقابل عمل قرار پائیں گی، حالانکہ ان احادیث پر تمام امت آج تک عمل پیرا ہے اور شریعت اسلامیہ کا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے کہ شرائط معلومہ کے ساتھ قابل زکوۃ اموال کے ایک معین حصہ ہی کا ادا کرنا فرض ہے، ضروریات سے زیادہ کل

مال کا خرچ کرنا فرض نہیں ہے، اگر زائد از ضرورت کل مال کا خرچ کرنا لازمی حکم ہوتا ہے تو مال کے مقررہ حصہ کا بطور زکوٰۃ کے ادا کرنا فرض نہ ہوتا بلکہ کل مال کا خرچ کرنا فرض ہوتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس آیت ۲۱۹ کے حوالہ سے امت کو ضرورت سے زیادہ کل مال کے خرچ کرنے کی ہدایت فرماتے اور زکوٰۃ میں ادا کرنے کے لیے حصے مقرر نہ فرماتے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہو گا کہ آیت ۲۱۹ کا جو مفہوم زیر نظر مضمون میں بتلایا گیا ہے یہ اخلاقی نوعیت کی استحبابی تعلیم تھی کہ جس مسلمان کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ہو تو وہ اس کو دوسرے مسلمان بھائی کو مفت دے دے اس لیے کہ ایسا کرنے پر اگر ہر شخص کو قانوناً مجبور کر دیا جاتا تو ضروریات سے زیادہ بقدر نصاب مال کا کوئی مسلمان بھی مالک نہ ہو سکتا اور کسی مسلمان پر بھی زکوٰۃ فرض ہونے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور وراثت و وصیت کے احکام کا بھی اس جبری قانون سے متاثر ہونا لازم آتا۔

ضرورت سے زائد مال کا ملک میں رکھنا

سورۃ نساء آیت ۲۰ میں شوہر کو فرمایا گیا ہے:

"تم اس کو (یعنی بیوی کو) ایک ڈھیر کا ڈھیر مال دے چکے

ہو تو بھی اس سے کچھ واپس نہ لو''معلوم ہوا کہ شوہر ضرورت سے زیادہ مال اور وہ بھی ڈھیر کے ڈھیر کا مالک تھا اور ڈھیر کا ڈھیر مال ضروریات میں داخل نہیں ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ ضروریات سے زیادہ مال ملک میں رکھنا درست ہے جو اسے مہر وغیرہ کے موقع پر کام آسکے، اگر ضرورت سے زیادہ مال رکھنا ممنوع ہوتا تو ایسے موقعوں پر ڈھیر کا ڈھیر خرچ کرنے کے لیے کسی کے پاس کیسے جمع ہوسکتا تھا۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا کہ ''تمہارا اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا چھوڑ جاؤ'' (بخاری ج۱)

اس حدیث سے واضح ہے کہ غنی مالدار ہونا اسلام میں نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں بلکہ صاحب مال لوگوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے وارثوں کے لیے اس قدر مال چھوڑ جائیں کہ وہ اس کو حاصل کر کے مالدار اور غنی بن جائیں۔

کسی کا مال بدوں اس کی خوش دلی کے حلال نہیں

قرآن واحادیث کی رو سے کسی اموال میں مالک کی رضامندی کے بغیر جبراً کسی طرح کا تصرف کرنا ظلم، قطعاً حرام اور قرآن حدیث کی صریح

تعلیمات کے خلاف ہے ۔قرآن کی آیت بقرہ ۱۸۷ میں ہے:

''مت کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں غلط طریقہ سے اور ہوسکتا ہے کہ کسی یتیم اور نابالغ کا بھی اس میں حق ہو''۔

پھر تو ناحق تصرف کرنے والا سورۃ نساء کی آیت ۹ کا پورا مصداق ہے کہ ''جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں'' اور حدیث میں واضح ہدایت موجود ہے کہ کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

غیر شرعی فیصلہ

اس لیے یہ فیصلہ اسلامی نہیں ہے کہ ہر خاندان ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے اور ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لا کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دے۔

بالفرض اگر اس اصول کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ اصول صرف مکانات کے ساتھ ہی خاص نہیں ہونا چاہیے بلکہ نقد، زیور، خوراک پوشاک، فرنیچر وغیرہ تمام خانگی سامان آرائش کو بھی حاوی ہونا چاہیے اور ایک مکان سے زائد مکانات کی طرح ہر شخص کے لیے ایک دو جوڑا ضروری کپڑوں کا اور دو ایک ضروری برتنوں اور ایک ایک چارپائی اور وہ بھی بہت ہی معمولی قیمت اور گھٹیا قسم کے (کیونکہ

ضرورت تو معمولی اور گھٹیا قسم کے سامان سے بھی پوری ہو سکتی ہے)
رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے اس کے علاوہ تمام زائد سامان واسباب کی
تقسیم دوسرے ضرورت مندوں پر کر دینی لازم ہو گی۔

قابل توجہ

جن لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کا یہ اصول ثابت ہے معلوم نہیں کہ وہ
اس کو صرف مکانات کے بارہ میں ہی کیوں جاری کرنا چاہتے ہیں دوسرے خانگی
اسباب و سامان معیشت بلکہ سامان تعیش کے بارہ میں اس اصول کو کیوں جاری
نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ ان لوگوں کے گھر بھی زائد از ضرورت سامان سے
بھرے ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے نہ تو لباس میں ہی اسلامی سادگی کے آثار نظر
آتے ہیں اور نہ ہی کھانے پینے کے اندر ہی سادہ طرز کی کوئی جھلک
محسوس ہوتی ہے بلکہ لباس اور خوراک میں ضرورت سے زیادہ تفاخر اور
تکلف کی نمائش کا اہتمام ہے اور گھریلو سامان کے جمع کرنے میں بھی
ضرورت کی حد سے کہیں زیادہ زینت وآرائش کی خاطر اسراف اور
فضول خرچی کی حد تک خرچ کیا جاتا ہے اور اس کو اپنے تسلیم شدہ اس
اصول کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

پھر ایک مکان میں بھی کچی اور سادہ تعمیر سے ضرورت پوری کی

جاسکتی ہے مگر پختہ اور سیمنٹڈ،عالیشان مکان کو ضروری سمجھا جاتا ہے حالانکہ پختہ مکان اور پھر اس قدر اونچا اور وسیع زائد از ضرورت ہے اور خود ان لوگوں کو تسلیم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جہانوں کے سردار ہونے کے باوجود ایک نہایت سادہ سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہر ایک خاندان کے لیے ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھنے کی جو اجازت دی جائے گی اس کے لیے ایک نہایت ہی سادہ مکان جس طرح کے مکان میں دونوں جہانوں کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سادہ زندگی بسر فرما گئے ہیں معیار قرار دیا جائے گا، یا آج کل کے سرمایہ داری سے نفرت کا وعظ کرنے والے اور ضروریات سے زائد ہر چیز دوسروں کو دینے کی دعوت دینے والے سوشلسٹوں کی عالیشان بلڈنگ کہ جو سرمایادارانہ ذہنیت کی حسین، دلربا اور دلکش تصویر بنی ہوئی دعوت نظارہ دے رہی ہوتی ہے کو معیار بنایا جائے گا پھر دیہات اور قصبات کے مکانات اور لاہور اور کراچی وغیرہ کے مکانات میں سے کتنے بڑے مکان اور کوٹھی بنگلہ کے کس ڈیزائن اور کس قسم کے میٹریل سے بنی ہوئی عمارت مثالی سمجھی جائے گی اور اس سے زیادہ کو زائد از ضرورت سمجھا جائے گا اور وہ قانوناً ممنوع ہو گی۔

ہر سمجھدار آدمی غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس معاملہ میں ایک ہی طرح کی طرز تعمیر کا سب کے لیے متعین کرنا عملی طور پر تقریباً ناممکن ہے اور امتیاز رکھنے کو ناجائز کہا جا رہا ہے۔ پھر اگر لاہور جیسے شہر میں ایک مکان کے ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہو تو اتنی ہی مالیت کے متعدد مکانوں کا قصبات اور دیہات میں بنالینا اور ان کو ملکیت میں رکھنا کیوں اور کس دلیل سے ناجائز اور ممنوع قرار دیا جا سکے گا اور اگر مالک کی گزر اوقات کا ذریعہ مکانات کا کرایہ ہو اور وہ اس کے ذریعہ زندگی گزار رہا ہو پھر تو ان کو زائد از ضرورت بھی کسی جگہ اور کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔

ایسی حالت میں تو یہ قانون کہ صرف ایک مکان ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہے عقلاً و نقلاً کسی طرح بھی اور کسی جگہ بھی درست نہیں ہو سکتا۔

ملازم پیشہ طبقہ کے لیے مشکلات

اس کے علاوہ طبقہ ملازمین کے لیے اس اقدام سے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے کس قدر مشکلات پیش آنے کا امکان ہے۔ اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ طبقہ اپنے ذاتی مکانات جو ان کی ملک میں ہوں کرایہ پر نہیں دے سکے گا اس لیے کہ اس کو

کرایے پر دینا بے سود ہو گا اور مکان اس کا ہو گا جو اس میں رہائش پذیر ہے لہٰذا اسی طبقہ کے ہاتھ سے ان کے مملوکہ مکانات نقل کیے جائیں گے بلکہ اس اقدام کے بعد جائے ملازمت پر کوئی مکان کرایے سے ان کو حاصل نہیں ہو سکے گا کیونکہ ضرورت سے زیادہ کسی کو مکان بنانے کی اجازت ہی نہ ہو گی تو پھر اس طبقہ کے لیے مکانات کا کیا انتظام ہو گا؟۔

اگر حکومت ان کے مکانات کی ذمہ داری قبول کرلے اور ملازمین کے لیے مکانات تعمیر کر کے ان کی رہائش کا انتظام کرلے تو علاوہ اس کے کہ اس طرح سرکاری خزانہ پر زبردست مالی بوجھ پڑ جائے گا ان ملازمین کے اپنے ذاتی مکانات کا کیا حشر ہو گا ان کو حکومت ضبط کر کے ان پر غاصبانہ قبضہ کرلے گی اس سے تحفظ کی کیا صورت ہو گی اور ملازم کی برخواستگی یا مدت ملازمت کے پورا ہونے کے بعد اس ملازم اور اس کے اہل و عیال کے لیے رہائش کا کیا انتظام کیا جائے گا؟۔

حدیث سے غلط استدلال

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول مضمون نگار بالفرض اگر ایک صحابی کا اس لیے سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا کہ اس نے اپنے بھائیوں پر امتیاز حاصل کرتے ہوئے کچھ ضرورت سے زائد عمارت تعمیر کرلی تھی تو پھر ایک پختہ بلڈنگ اور عالیشان مکان بھی ضروریات سے زائد ہی

ہے عمارت کے پختہ اور سمینٹڈ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔
رہائش کی ضرورت کچی اور سادہ عمارت سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔

اس سادگی کی تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو دی تھی جنہوں نے اپنے مکان کو پختہ اور بلند بنالیا تھا اس عملی مثال میں اس اصول کی طرف ادنیٰ سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اور اس غاصبانہ طرز عمل کا ثبوت تو اس سے کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لے کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کردے جیسا کہ زیر تبصرہ مضمون میں اس غصب وظلم کے ثابت کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ کیا مضمون نگار یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ اس مثالی واقعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے وہ مکان لے کر کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دیا تھا حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال اور مکان ان صحابی کے قبضہ میں ہی رہنے دیا گیا۔ نہ تو ان سے لے کر کسی اور کو دیا گیا تھا اور نہ ہی خود ان کو کسی اور کو دینے کا حکم صادر فرمایا گیا تھا۔ صرف عمارتوں میں سادگی کی تعلیم دی گئی تھی۔

سادگی کی تعلیم

ابو داود کے حوالہ سے جس حدیث کا تذکرہ مضمون نگار نے کیا

ہے اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ تعمیرات پھر خواہ مکان ہو یاد کان یا کوئی اور عمارت ہو میں سادگی کو اختیار کیا جائے۔ عمارت میں فضول خرچی کرنے کو وبال فرمایا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک سے زائد مکان فضول خرچی میں شمار ہو گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یہ مکانات چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شبلی نعمانی ص ۲۸۲ ج ۱)

واقعہ کی اصل حقیقت

اس سادگی کے خلاف ایک صحابی کا طرز عمل ملاحظہ فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض فرمایا ان صحابی نے اپنے بے نظیر جذبہ محبت سے متاثر ہو کر بغیر کسی حکم کے اپنی اصلاح اور نفس کشی کی خاطر اس پختہ عمارت کو گرا کر خوشنودی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تمغہ حاصل کر لیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعراض یقیناً تادیب و تکمیل اخلاق کی غرض سے تھا۔ اور یہ اخلاقی تعلیم بھی لازمی تعلیم نہ تھی ورنہ

آپ زبان مبارک سے تنبیہ کے ساتھ اس کو گرانے کا حکم صادر فرماتے اور صرف بے التفاتی کے ذریعہ ہی ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفاء نہ فرماتے اور اس نہایت لطیف انداز تربیت اور محبوبانہ طرز تادیب کو سوشل بائیکاٹ سے موسوم کردینا یہ صرف اس زمانہ کی ایجاد اور اس کا بہت ہی غلط، بے جا استعمال ہے۔ کسی ایک صحابی کو بھی ان سے سلام و کلام سے منع نہیں کیا گیا تھا۔

قیاس فاسد

واقعہ کی اس حقیقت سے اعراض و روگردانی کرکے ہمارے زمانہ میں یہ لوگ پختہ اور بلند عمارتوں کو تو اسلامی سادہ طرز زندگی کے خلاف نہیں سمجھتے مگر ایسے لوگوں کی طرف سے اسلامی اصول کے خلاف مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں اپنے قیاس فاسد سے داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے چنانچہ زیر نظر مضمون میں بھی لکھا ہے: ''اگر سرمایے کی ایک خاص مقدار بینک میں جمع کراکے اس کا نفع حاصل کیا جائے تو وہ بالاتفاق سود تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے اگر خاص مقدار سے کوئی مکان خرید کر کرایہ پر اٹھادیا جائے تو اس کا کرایہ سود کی تعریف سے خارج نہ ہوگا''۔

بینک میں جمع شدہ رقم کے منافع پر مکان کے کرایہ کو قیاس

کر کے سود کی تعریف میں داخل کرنا عقلاً ونقلاً قطعاً غلط اور اسلامی اصول سے بے خبری پر مبنی ہے ،اس لیے کہ مفروضہ مثال میں نقد رقم کے معاوضہ میں اپنی جمع شدہ رقم سے مکان خریدنے کے بعد اس کا جو کرایہ وصول ہو گا وہ نقد رقم کا نفع نہیں ہو گا بلکہ مکان کا نفع ہو گا اور جنس تبدیل ہو جانے اور شرائط سود نہ پائے جانے کی وجہ سے سود کی تعریف سے خارج ہو گا یہی وجہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیہ کا مکان خرید کر سوا لاکھ میں بیچنا اور پچیس ہزار اس پر نفع حاصل کرنا سود اور ناجائز نہیں ہے۔

مضمون نگار کی منطق کی رو سے تو مذکورہ مثال میں مکان کی بیع کا نفع بھی ناجائز اور سود ہونا چاہیے حالانکہ اس کو سوائے ان مکہ والوں کے اور کوئی بھی مسلمان صحیح تسلیم نہیں کرسکتا جنہوں نے بیع اور سود کو برابر کہا تھا، حالانکہ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام (سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۷۴) اور اگر مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں داخل کیا جائے گا تو پھر دکانوں کے کرایہ کا کیا حکم ہو گا؟ اور برتن وغیرہ میز، کرسی نیز فرنیچر شامیانے کو کرایہ پر دینا بھی سود میں شامل ہو کر ناجائز ہو جائے گا۔ اسی طرح لاری ، کار، ویگن ،ریل ،ہوائی جہاز وغیرہ کا کرایہ بھی سود قرار پائے گا۔

آخری گزارش

اب جبکہ **ملک** عزیز میں اسلامی نظام کی طرف پیش رفت جاری ہے مناسب ہے کہ ایسے وقت میں اسلامی تعلیمات کے پیش نظر سادہ زندگی کو اپنایا جائے تعمیرات کے ساتھ خوراک وپوشاک میں بھی اسلامی سادہ وضع وقطع کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہو سکے اسراف وفضول خرچی سے پرہیز کیا جائے مگر اس مقصد کے لیے کسی سوشلسٹ یا سرمایہ دار **ملک** کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دینے کی بجائے چودہ سو سالہ مسلمہ اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کی جائے اور قرآن وحدیث کی من مانی غلط تشریحات کے ذریعہ متفقہ اجماعی مسائل کو موضوع بحث بنا کر ملت اسلامیہ میں ذہنی انتشار سے کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔

فقیہ العصر مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ

''رہائشی تعمیرات کی شرعی حیثیت''

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

جنگ ۲۱ر دسمبر ۱۹۸۱ء میں عنوان بالا کے تحت (رفیع اللہ شہاب کے مضمون میں) بعض آیات واحادیث کی غلط تشریح کرتے ہوئے اس اصول کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۹ کے لفظ ''عفو'' کا ترجمہ ضروریات سے زائد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جو کچھ تمہاری ضروریات سے زائد ہے وہ تم دوسرے بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے پر خرچ کردو''۔

آیت قرآنی کا صحیح مفہوم

حالانکہ پوری آیت کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس سوال کرنے پر کہ کیا خرچ کریں؟ ان کو بتلایا گیا کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

اور سوال کرنے پر جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کو بتلایا گیا وہ حکم لازمی نہیں ہو سکتا کیونکہ لازمی اور ضروری حکم تو بغیر پوچھے ہی

بتلایا جاتا ہے اس لیے اس سوال کے جواب میں جو زائد از ضرورت خرچ کرنے کا ذکر اس آیت میں فرمایا گیا ہے اس پر عمل کرنا ضروری قرار نہیں دیا جاسکتا اختیاری ہی ہوسکتا ہے، اس کے علاوہ اس لفظ کے ترجمہ میں بڑی وسعت ہے مفسرین نے اس کا ترجمہ دوسری طرح بھی کیا ہے اور اس سے وہ مال مراد لیا ہے جس کا خرچ کرنا بار خاطر نہ ہو، اس معنی کے پیش نظر پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ آپ فرمادیجئے کہ جتنا آسان ہو''۔

نیز تفسیر ابن کثیر میں ''عفو'' کا معنی ستھرا، پاکیزہ اور عمدہ مال بھی کیا گیا ہے، اور یہ معنی امام ربیع سے منقول ہیں، اس کے لحاظ سے آیت بالا کا مفہوم یہ ہوگا کہ خدا کی راہ میں جو خرچ کیا جائے وہ عمدہ مال ہو گھٹیا نہ ہو۔

شرعی احکام کا ساقط قرار پانا

اگر زیر نظر مضمون میں ذکر کردہ یہ معنی درست تسلیم کرلیے جائیں کہ جو کچھ ضروریات سے زائد ہو وہ دوسروں کو دے دیا کرو اور اس حکم کو اختیاری تعلیم کی بجائے لازمی مان لیا جائے تو اس معنی کی رو سے دوسری آیات واحادیث سے ثابت شدہ بہت سے احکام مثل زکوۃ وغیرہ کے ساقط ہوجائیں گے اور دوسری آیت کے بھی یہ معنی خلاف

ہو جائیں گے، چنانچہ سورۃ بقرہ آیت نمبر ۳ میں ہے: ''جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

اور آیت ۲۶۷ میں ہے: ''اے ایمان والو خرچ کرو عمدہ چیز کو اپنی کمائی میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہے''۔

اس طرح کی اور دوسری آیات میں بھی یہی مضمون ہے کہ اللہ نے جو مال عطا فرمایا ہے اور زمین میں سے جو کچھ پیدا کیا ہے اس مال اور پیداوار میں سے کچھ حصہ خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی تشریح حدیثوں میں کر دی گئی ہے کہ وہ کتنا حصہ ہے جس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنا لازمی ہے۔

اگر ضروریات سے زائد کل مال دوسروں کو دے دینا ضروری ہو تو حدیثوں میں اس حصہ کو معین کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی اور ایسی سب حدیثیں جن میں مال کے حصہ معینہ کے خرچ کرنے کا حکم بطور فرض کے دیا گیا ہے بے ضرورت اور نا قابل عمل قرار پائیں گی، حالانکہ ان احادیث پر تمام امت آج تک عمل پیرا ہے اور شریعت اسلامیہ کا متفق علیہ اجماعی مسئلہ ہے کہ شرائط معلومہ کے ساتھ قابل زکوۃ اموال کے ایک معین حصہ ہی کا ادا کرنا فرض ہے، ضروریات سے زیادہ کل

مال کاخرچ کرنافرض نہیں ہے، اگر زائد از ضرورت کل مال کاخرچ کرنالازمی حکم ہوتا ہے تومال کے مقررہ حصہ کابطور زکوۃ کے ادا کرنا فرض نہ ہوتا بلکہ کل مال کاخرچ کرنافرض ہوتا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس آیت ۲۱۹ کے حوالہ سے امت کوضرورت سے زیادہ کل مال کے خرچ کرنے کی ہدایت فرماتے اور زکوۃ میں ادا کرنے کے لیے حصے مقرر نہ فرماتے۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیاہو گا کہ آیت ۲۱۹ کاجو مفہوم زیر نظر مضمون میں بتلایا گیا ہے یہ اخلاقی نوعیت کی استحبابی تعلیم تھی کہ جس مسلمان کے پاس اس کی ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ہو تووہ اس کو دوسرے مسلمان بھائی کومفت دے دے اس لیے کہ ایسا کرنے پر اگر ہر شخص کو قانوناً مجبور کر دیا جاتا توضروریات سے زیادہ بقدر نصاب مال کا کوئی مسلمان بھی مالک نہ ہوسکتااور کسی مسلمان پر بھی زکوۃفرض ہونے کی کوئی صورت ممکن نہ رہتی اور وراثت ووصیت کے احکام کا بھی اس جبری قانون سے متاثر ہونالازم آتا۔

ضرورت سے زائد مال کا ملک میں رکھنا

سورۃ نساءآیت ۲۰میں شوہر کوفرمایا گیاہے:

"تم اس کو(یعنی بیوی کو) ایک ڈھیر کاڈھیر مال دے چکے

ہو تو بھی اس سے کچھ واپس نہ لو" معلوم ہوا کہ شوہر ضرورت سے زیادہ مال اور وہ بھی ڈھیر کے ڈھیر کا مالک تھا اور ڈھیر کا ڈھیر مال ضروریات میں داخل نہیں ہوتا، اس سے ثابت ہوا کہ ضروریات سے زیادہ مال ملک میں رکھنا درست ہے جو اسے مہر وغیرہ کے موقع پر کام آسکے، اگر ضرورت سے زیادہ مال رکھنا ممنوع ہوتا تو ایسے موقعوں پر ڈھیر کا ڈھیر خرچ کرنے کے لیے کسی کے پاس کیسے جمع ہوسکتا تھا۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو فرمایا کہ "تمہارا اپنے وارثوں کو غنی چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم ان کو محتاج اور دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا چھوڑ جاؤ" (بخاری ج۱)

اس حدیث سے واضح ہے کہ غنی مالدار ہونا اسلام میں نہ صرف یہ کہ ممنوع نہیں بلکہ صاحب مال لوگوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ اپنے وارثوں کے لیے اس قدر مال چھوڑ جائیں کہ وہ اس کو حاصل کر کے مالدار اور غنی بن جائیں۔

کسی کا مال بدوں اس کی خوش دلی کے حلال نہیں

قرآن واحادیث کی رو سے کسی اموال میں مالک کی رضامندی کے بغیر جبراً کسی طرح کا تصرف کرنا ظلم، قطعاً حرام اور قرآن حدیث کی صریح

تعلیمات کے خلاف ہے ۔قرآن کی آیت بقرہ ۱۸۷ میں ہے:

''مت کھاؤ ایک دوسرے کا مال آپس میں غلط طریقہ سے اور ہوسکتا ہے کہ کسی یتیم اور نابالغ کا بھی اس میں حق ہو''۔

پھر تو ناحق تصرف کرنے والا سورۃ نساء کی آیت ۹ کا پورا مصداق ہے کہ ''جو لوگ یتیموں کے مال کو ظلم سے کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں'' اور حدیث میں واضح ہدایت موجود ہے کہ کسی شخص کا مال اس کی خوش دلی کے بغیر حلال نہیں ہے۔

غیر شرعی فیصلہ

اس لیے یہ فیصلہ اسلامی نہیں ہے کہ ہر خاندان ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھ سکتا ہے اور ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لا کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کر دے۔

بالفرض اگر اس اصول کو درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ اصول صرف مکانات کے ساتھ ہی خاص نہیں ہونا چاہیے بلکہ نقد، زیور، خوراک پوشاک، فرنیچر وغیرہ تمام خانگی سامان آرائش کو بھی حاوی ہونا چاہیے اور ایک مکان سے زائد مکانات کی طرح ہر شخص کے لیے ایک دو جوڑا ضروری کپڑوں کا اور دو ایک ضروری برتنوں اور ایک ایک چارپائی اور وہ بھی بہت ہی معمولی قیمت اور گھٹیا قسم کے (کیونکہ

ضرورت تو معمولی اور گھٹیا قسم کے سامان سے بھی پوری ہو سکتی ہے)
رکھنے کی اجازت ہونی چاہیے اس کے علاوہ تمام زائد سامان واسباب کی
تقسیم دوسرے ضرورت مندوں پر کر دینی لازم ہو گی۔

قابل توجہ

جن لوگوں کے نزدیک قرآن کریم کا یہ اصول ثابت ہے معلوم نہیں کہ وہ
اس کو صرف مکانات کے بارہ میں ہی کیوں جاری کرنا چاہتے ہیں دوسرے خانگی
اسباب و سامان معیشت بلکہ سامان تعیش کے بارہ میں اس اصول کو کیوں جاری
نہیں کرنا چاہتے۔ حالانکہ ان لوگوں کے گھر بھی زائد از ضرورت سامان سے
بھرے ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کے نہ تو لباس میں ہی اسلامی سادگی کے آثار نظر
آتے ہیں اور نہ ہی کھانے پینے کے اندر ہی سادہ طرز کی کوئی جھلک
محسوس ہوتی ہے بلکہ لباس اور خوراک میں ضرورت سے زیادہ تفاخر اور
تکلف کی نمائش کا اہتمام ہے اور گھریلو سامان کے جمع کرنے میں بھی
ضرورت کی حد سے کہیں زیادہ زینت و آرائش کی خاطر اسراف اور
فضول خرچی کی حد تک خرچ کیا جاتا ہے اور اس کو اپنے تسلیم شدہ اس
اصول کے خلاف نہیں سمجھا جاتا۔

پھر ایک مکان میں بھی کچی اور سادہ تعمیر سے ضرورت پوری کی

جاسکتی ہے مگر پختہ اور سیمنٹڈ،عالیشان مکان کوضروری سمجھا جاتا ہے حالانکہ پختہ مکان اور پھر اس قدر اونچا اور وسیع زائد از ضرورت ہے اور خود ان لوگوں کو تسلیم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دونوں جہانوں کے سردار ہونے کے باوجود ایک نہایت سادہ سے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہر ایک خاندان کے لیے ایک مکان اپنی ملکیت میں رکھنے کی جو اجازت دی جائے گی اس کے لیے ایک نہایت ہی سادہ مکان جس طرح کے مکان میں دونوں جہانوں کے سردار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سادہ زندگی بسر فرما گئے ہیں معیار قرار دیا جائے گا، یا آج کل کے سرمایہ داری سے نفرت کا وعظ کرنے والے اور ضروریات سے زائد ہر چیز دوسروں کو دینے کی دعوت دینے والے سوشلسٹوں کی عالیشان بلڈنگ کہ جو سرمایادارانہ ذہنیت کی حسین، دلربا اور دلکش تصویر بنی ہوئی دعوت نظارہ دے رہی ہوتی ہے کو معیار بنایا جائے گا پھر دیہات اور قصبات کے مکانات اور لاہور اور کراچی وغیرہ کے مکانات میں سے کتنے بڑے مکان اور کوٹھی بنگلہ کے کس ڈیزائن اور کس قسم کے میٹریل سے بنی ہوئی عمارت مثالی سمجھی جائے گی اور اس سے زیادہ کو زائد از ضرورت سمجھا جائے گا اور وہ قانوناً ممنوع ہو گی۔

ہر سمجھدار آدمی غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ اس معاملہ میں ایک ہی طرح کی طرز تعمیر کا سب کے لیے متعین کرنا عملی طور پر تقریباً ناممکن ہے اور امتیاز رکھنے کو ناجائز کہا جارہا ہے۔ پھر اگر لاہور جیسے شہر میں ایک مکان کے ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہو تو اتنی ہی مالیت کے متعدد مکانوں کا قصبات اور دیہات میں بنالینا اور ان کو ملکیت میں رکھنا کیوں اور کس دلیل سے ناجائز اور ممنوع قرار دیا جاسکے گا اور اگر مالک کی گزراوقات کا ذریعہ مکانات کا کرایہ ہو اور وہ اس کے ذریعہ زندگی گزار رہا ہو پھر تو ان کو زائداز ضرورت بھی کسی جگہ اور کسی طرح نہیں کہا جاسکتا۔

ایسی حالت میں تو یہ قانون کہ صرف ایک مکان ملکیت میں رکھنے کی اجازت ہے عقلاً ونقلاً کسی طرح بھی اور کسی جگہ بھی درست نہیں ہوسکتا۔

ملازم پیشہ طبقہ کے لیے مشکلات

اس کے علاوہ طبقہ ملازمین کے لیے اس اقدام سے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے کس قدر مشکلات پیش آنے کا امکان ہے۔ اس سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ یہ طبقہ اپنے ذاتی مکانات جو ان کی ملک میں ہوں کرایہ پر نہیں دے سکے گا اس لیے کہ اس کو

کرایے پر دینا بے سود ہو گا اور مکان اس کا ہو گا جو اس میں رہائش پذیر ہے لہٰذا اسی طبقہ کے ہاتھ سے ان کے مملوکہ مکانات نقل کیے جائیں گے بلکہ اس اقدام کے بعد جائے ملازمت پر کوئی مکان کرایے سے ان کو حاصل نہیں ہو سکے گا کیونکہ ضرورت سے زیادہ کسی کو مکان بنانے کی اجازت ہی نہ ہو گی تو پھر اس طبقہ کے لیے مکانات کا کیا انتظام ہو گا؟۔

اگر حکومت ان کے مکانات کی ذمہ داری قبول کرلے اور ملازمین کے لیے مکانات تعمیر کر کے ان کی رہائش کا انتظام کرلے تو علاوہ اس کے کہ اس طرح سرکاری خزانہ پر زبردست مالی بوجھ پڑ جائے گا ان ملازمین کے اپنے ذاتی مکانات کا کیا حشر ہو گا ان کو حکومت ضبط کر کے ان پر غاصبانہ قبضہ کرلے گی اس سے تحفظ کی کیا صورت ہو گی اور ملازم کی برخواستگی یا مدت ملازمت کے پورا ہونے کے بعد اس ملازم اور اس کے اہل وعیال کے لیے رہائش کا کیا انتظام کیا جائے گا؟۔

حدیث سے غلط استدلال

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول مضمون نگار بالفرض اگر ایک صحابی کا اس لیے سوشل بائیکاٹ کر دیا تھا کہ اس نے اپنے بھائیوں پر امتیاز حاصل کرتے ہوئے کچھ ضرورت سے زائد عمارت تعمیر کرلی تھی تو پھر ایک پختہ بلڈنگ اور عالیشان مکان بھی ضروریات سے زائد ہی

ہے عمارت کے پختہ اور سمینٹڈ ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ رہائش کی ضرورت کچی اور سادہ عمارت سے بھی پوری ہو سکتی ہے۔

اس سادگی کی تعلیم حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی کو دی تھی جنہوں نے اپنے مکان کو پختہ اور بلند بنالیا تھا اس عملی مثال میں اس اصول کی طرف ادنیٰ سا بھی اشارہ نہیں ہے کہ مکان اس کا ہے جو اس میں رہائش پذیر ہے اور اس غاصبانہ طرز عمل کا ثبوت تو اس سے کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک سے زائد مکان حکومت اپنے تصرف میں لے کر ضرورت مند لوگوں میں تقسیم کردے جیسا کہ زیر تبصرہ مضمون میں اس غصب وظلم کے ثابت کرنے کی جرأت کی گئی ہے۔ کیا مضمون نگار یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اس مثالی واقعہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے وہ مکان لے کر کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دیا تھا حقیقت واقعہ یہ ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال اور مکان ان صحابی کے قبضہ میں ہی رہنے دیا گیا۔ نہ تو ان سے لے کر کسی اور کو دیا گیا تھا اور نہ ہی خود ان کو کسی اور کو دینے کا حکم صادر فرمایا گیا تھا۔ صرف عمارتوں میں سادگی کی تعلیم دی گئی تھی۔

سادگی کی تعلیم

ابو داود کے حوالہ سے جس حدیث کا تذکرہ مضمون نگار نے کیا

ہے اس حدیث سے بھی یہی ثابت ہو رہا ہے کہ تعمیرات پھر خواہ مکان ہو یا دکان یا کوئی اور عمارت ہو میں سادگی کو اختیار کیا جائے۔ عمارت میں فضول خرچی کرنے کو وبال فرمایا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایک سے زائد مکان فضول خرچی میں شمار ہو گا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ یہ مکانات چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لمبے تھے چھت اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر چھت کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا کپڑا پڑا رہتا تھا۔ راتوں کو چراغ نہیں جلتے تھے۔ (سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم، شبلی نعمانی ص ۲۸۲ ج۱)

واقعہ کی اصل حقیقت

اس سادگی کے خلاف ایک صحابی کا طرز عمل ملاحظہ فرما کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اعراض فرمایا ان صحابی نے اپنے بے نظیر جذبہ محبت سے متاثر ہو کر بغیر کسی حکم کے اپنی اصلاح اور نفس کشی کی خاطر اس پختہ عمارت کو گرا کر خوشنودی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تمغہ حاصل کر لیا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعراض یقیناً تادیب و تکمیل اخلاق کی غرض سے تھا۔ اور یہ اخلاقی تعلیم بھی لازمی تعلیم نہ تھی ورنہ

آپ زبان مبارک سے تنبیہ کے ساتھ اس کو گرانے کا حکم صادر فرماتے اور صرف بے التفاتی کے ذریعہ ہی ناپسندیدگی کے اظہار پر اکتفاء نہ فرماتے اور اس نہایت لطیف انداز تربیت اور محبوبانہ طرز تادیب کو سوشل بائیکاٹ سے موسوم کر دینا یہ صرف اس زمانہ کی ایجاد اور اس کا بہت ہی غلط، بے جا استعمال ہے ۔ کسی ایک صحابی کو بھی ان سے سلام و کلام سے منع نہیں کیا گیا تھا۔

قیاس فاسد

واقعہ کی اس حقیقت سے اعراض و رو گردانی کر کے ہمارے زمانہ میں یہ لوگ پختہ اور بلند عمارتوں کو تو اسلامی سادہ طرز زندگی کے خلاف نہیں سمجھتے مگر ایسے لوگوں کی طرف سے اسلامی اصول کے خلاف مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں اپنے قیاس فاسد سے داخل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے چنانچہ زیر نظر مضمون میں بھی لکھا ہے: ''اگر سرمایے کی ایک خاص مقدار بینک میں جمع کرا کے اس کا نفع حاصل کیا جائے تو وہ بالاتفاق سود تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے اگر خاص مقدار سے کوئی مکان خرید کر کرایہ پر اٹھا دیا جائے تو اس کا کرایہ سود کی تعریف سے خارج نہ ہو گا''۔

بینک میں جمع شدہ رقم کے منافع پر مکان کے کرایہ کو قیاس

کر کے سود کی تعریف میں داخل کرنا عقلاً ونقلاً قطعاً غلط اور اسلامی اصول سے بے خبری پر مبنی ہے، اس لیے کہ مفروضہ مثال میں نقد رقم کے معاوضہ میں اپنی جمع شدہ رقم سے مکان خریدنے کے بعد اس کا جو کرایہ وصول ہوگا وہ نقد رقم کا نفع نہیں ہوگا بلکہ مکان کا نفع ہوگا اور جنس تبدیل ہو جانے اور شرائط سود نہ پائے جانے کی وجہ سے سود کی تعریف سے خارج ہوگا یہی وجہ ہے کہ مثلاً ایک لاکھ روپیہ کا مکان خرید کر سوا لاکھ میں بیچنا اور پچیس ہزار اس پر نفع حاصل کرنا سود اور ناجائز نہیں ہے۔

مضمون نگار کی منطق کی رو سے تو مذکورہ مثال میں مکان کی بیع کا نفع بھی ناجائز اور سود ہونا چاہیے حالانکہ اس کو سوائے ان مکہ والوں کے اور کوئی بھی مسلمان صحیح تسلیم نہیں کر سکتا جنہوں نے بیع اور سود کو برابر کہا تھا، حالانکہ بیع کو اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام (سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۷۴) اور اگر مکان کے کرایہ کو سود کی تعریف میں داخل کیا جائے گا تو پھر دکانوں کے کرایہ کا کیا حکم ہوگا؟ اور برتن وغیرہ میز، کرسی نیز فرنیچر شامیانے کو کرایہ پر دینا بھی سود میں شامل ہو کر ناجائز ہو جائے گا۔ اسی طرح لاری، کار، ویگن، ریل، ہوائی جہاز وغیرہ کا کرایہ بھی سود قرار پائے گا۔

آخری گزارش

اب جبکہ **ملک** عزیز میں اسلامی نظام کی طرف پیش رفت جاری ہے مناسب ہے کہ ایسے وقت میں اسلامی تعلیمات کے پیش نظر سادہ زندگی کو اپنایا جائے تعمیرات کے ساتھ خوراک وپوشاک میں بھی اسلامی سادہ وضع وقطع کو اختیار کیا جائے اور جہاں تک ہوسکے اسراف وفضول خرچی سے پرہیز کیا جائے مگر اس مقصد کے لیے کسی سوشلسٹ یا سرمایہ دار **ملک** کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کا مشورہ دینے کی بجائے چودہ سو سالہ مسلمہ اسلامی اصولوں سے رہنمائی حاصل کی جائے اور قرآن وحدیث کی من مانی غلط تشریحات کے ذریعہ متفقہ اجماعی مسائل کو موضوع بحث بنا کر ملت اسلامیہ میں ذہنی انتشار سے کلی طور پر پرہیز کیا جائے۔